۳

مغرب زدہ عمرانی علوم کا تنقیدی جائزہ

کلاڈ الواریز

عمرانی علوم اور حقیقی دنیا

جنوری ۲۰۱۰ء میں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ عمرانیات نے اپنے احاطے میں ایک بالکل نئے 'یورپین اسٹڈی سنٹر' کا افتتاح کیا جس کے لیے مالی اعانت یورپی یونین نے کی۔ اس مرکز کا مقصد یورپی اہل علم کی مدد سے عمرانیات ایم اے اور ایم فل کے موجودہ نصاب کو نئی شکل دینا ہے۔ اس مرکز کے دوسالہ پروگرام کے لیے یورپی لوگ تین لاکھ یورو دینے کو تیار تھے۔[۱]

سیدھا سا سوال جو ہم پوچھ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ: جب اس زمین پر موجود دیگر تمام جامعات کے عمرانیات کے شعبوں کی طرح، دہلی یونیورسٹی کا شعبہ عمرانیات بھی اپنے قیام کے اول روز ہی سے یورپی عمرانیات پڑھا رہا ہے تو اس پروگرام کو شروع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

پہلے پہل ذہنی طور پر انحصاری اور غلامانہ ذہنیت، نوآبادیاتی نظام کا فطری نتیجہ تھی اور آج اسے اس وجہ سے خوش آمدید کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ نقد رقم بھی آتی ہے۔

مالی امداد حاصل کرنے کے چکر میں پھنسی ہوئی جامعات، جو موجودہ تشکیلی مطابقت (Structural Adjustment) کے مستقل دور کی دلدل میں دھنس چکی ہیں، ان کے لیے تعلیمی سرگرمی جاری رکھنے کا واحد راستہ یہی باقی رہ جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا مطلب یہ ہی کیوں نہ ہو کہ آپ دوسرے افراد کے دماغ کی پیداوار یا مصنوعات کو پھیلا کر اپنی روزی کما رہے ہیں۔

یورپین اسٹڈی سنٹر کی تجویز میں اشارتاً بھی اس بات کا ذکر نہیں کہ یہ دو برابر کے گروہوں کے مابین کوئی شراکت ہے اور یہ کہ ہندوستانی، یورپیوں کے اپنے سماجی مسائل کو حل کرنے کے لیے کوئی مدد کریں گے۔ وہ سماجی مسائل جن کی وہاں بہتات ہے مثلاً اقلیتوں کو ضم کرنے کا مسئلہ، ثقافتی برادریوں کے درمیان باہمی تعلقات کا مسئلہ، اجنبی غیر ملکی باشندوں کا مسئلہ، ریٹائر ہو جانے والے ملازمین کی دیکھ بھال کے مسائل، گھریلو تشدد اور نشہ آور اشیاء کے استعمال کے مسائل وغیرہ وغیرہ۔ ہم ابھی تک ایک ہی جانب قدم بڑھا رہے ہیں۔ یہ تمام حرکت 'برتر' یا 'ترقی یافتہ' تہذیب کی طرف سے 'کمتر' یا 'غیر ترقی یافتہ' تہذیب کی جانب ہے کیونکہ عالمگیر سطح پر جامعات میں علم کے نظام میں، علم کا بہاؤ اسی طرح سے ہے۔

اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ یونیسکو کی ورلڈ سوشل سائنس رپورٹ ۲۰۱۰ء میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یورپ سے باہر کی جانے والی سماجی سائنس کی تحقیق معیار میں اس قدر کم ہے کہ اس کا حوالہ ہی نہیں دیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر یہ رپورٹ اشارہ کرتی ہے کہ شمالی امریکہ نے ایشیا اور افریقہ دونوں ہی جگہوں سے کسی بھی تحقیق کا حوالہ نہیں دیا۔[۲]

سیاسی سامراجیت کو تو آج شدید مزاحمت کا سامنا ہے (ایران، ویت نام، افغانستان، مصر) لیکن تعلیمی سامراجیت کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ غالباً اس وجہ سے کہ یہ دکھائی نہیں دیتی۔ اس کے برعکس ایسا لگتا ہے کہ یہ اپنی شدت اور پھیلاؤ میں اضافہ کر رہی ہے۔

دنیا کی تقریباً تمام جامعات...... چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے...... یورپ کے تعلیمی دائروں میں رائج عمرانی علوم کے مقاصد اور طریقہ کار ہی کو جاری رکھے ہوئے ہیں (فرید العطاس نے اس جانب 'عمرانی علوم کی طاقت' میں بھرپور انداز میں اشارہ کیا ہے[۳])۔ آج تک ان کا مقصد مغربی سکالرز کے نکات ہی پر غور و فکر کرنا رہا ہے۔ غیر یورپی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جانے والی زیادہ تر عمرانی سائنس، عمرانیات کی مردہ لاش کے بے ذہن مطالعے یا مطالعے کی تکرار پر مبنی ہے۔ وہ علم جو نسلی مرکزیت کے جواب میں یا مخصوص طور پر یورپی حالات کے تصور میں عشروں یا صدیوں قبل تشکیل پذیر ہوا۔

آج کل، جہاں کہیں، حتیٰ کہ ایشیا اور افریقہ میں، تعلیمی کام ان محققین کی کوششوں سے، جو واقعی کوئی بامقصد کام کرنا چاہتے ہیں، مقامی معاملات سے متعلق ہوا ہے، وہاں بھی مروّجہ طریقہ کار، اور نظریاتی فریم ورک ابھی بھی بالکل ''یورپی امریکن'' ہے۔نوآبادیاتی نظام سے آزادی پانے کا اس سے زیادہ اور کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا کہ گزشتہ علمی آقاؤں کی جگہ پُر کرنے کے لیے آپس میں جھگڑنے کا موقع مل گیا ہے۔فطری طور پر، علمی اعتبار سے ایک بنجر دنیا میں اپنے وجود اور مقام کو دیکھتے ہوئے، ان کے لیے تخلیقی سوچ اور کام کی گنجائش بہت کم ہے۔

سماجی سائنس، جیسا کہ آج ہم اسے جانتے ہیں، یورپ کے سماجی مسائل کے حل کے لیے انہی کے مخصوص کردہ تحقیق کے کچھ خاص انداز اور طریقہ کار پر مبنی...... جو کہ یورپ کی علمی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں......اس یورپی تناظر کا نام ہے جس پر کوئی سوال ہی نہیں اٹھایا جا سکتا۔کیا یہ سائنس کبھی بھی دوسرے معاشرے کے لیے مفید ثابت ہوسکتی ہے، جس کے نہ صرف مسائل بلکہ انسانی تجربات بھی انتہائی مختلف ہیں؟علم کی اس ساخت کا اور یورپ سے باہر بسنے والے معاشروں کے افراد کی زندگیوں کے مابین کیا 'جذباتی' اور 'روحانی' تعلق ہوسکتا ہے؟

اس معاملے کا ایک اہم پہلو، ان طلبہ پر اس کے اثرات ہیں جو مختلف جامعات میں داخلہ لیتے ہیں۔وہ اس مفروضے کے ساتھ وہاں آتے ہیں کہ ان کے نصاب کی معیاری مقدار دراصل غیر ملکی یا اجنبی ہے جو ان کے آس پاس کی دنیا یا ان کی ثقافت کے اہم عناصر سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔اس لیے انہیں مجبوراً اپنے متعلقہ مضمون کی زبان رٹنا پڑتی ہے، اس کے طے شدہ معیار، لغت، نعروں، درجہ بندیوں اور اس کے تصورات کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑتا ہے، (اور یہ سب چیزیں فیشن کی طرح ہر چند سال بعد تبدیل ہوجاتی ہیں) تا کہ جب ان کا وقت آئے تو وہ بطور لیکچرر یا پروفیسر ان چیزوں کو اپنے طالب علموں کے سامنے دوبارہ اگل سکیں۔اور یہ مہارت اور اعتماد صرف اس صورت میں حاصل ہوتا ہے جب کئی سال تک سر جھکا کر بنا سوال اٹھائے یا بنا تنقید کیے ہر چیز کی قبولیت کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلیا جائے۔

مزید برآں، اپنی ہیئت کے اعتبار سے، یونیورسٹی ہر جگہ ہی اپنے حقیقی کردار اور مقصد کو بھول چکی ہے اور ایک ایسے فیکٹری اسکول کی ترقی یافتہ شکل اختیار کر چکی ہے جہاں علم کو کسی چیز کی مانند پھیلایا جاتا ہے اور طلبہ کے لیے کچھ تخلیق کرنے یا اپنا حصہ ڈالنے کا موقع کم ہی آتا ہے۔ دہلی کا یورپین اسٹڈی سنٹر اس امر کو یقینی بناتا ہے کہ نوجوان طالب علم چار ہفتے کے دورے پر یورپ جائیں، جس کے تمام اخراجات سنٹر خود اٹھائے گا۔ اس دورے کے دوران انہیں موقع دیا جائے گا کہ سیمینارز کے ذریعے جدید ترین اصطلاحات کی بھنک ان کے کانوں میں بھی پڑ سکے اور وہ جدید ترین تحقیقات اور یورپ کے ماہرین تعلیم کے خیالات سے خود کو روشناس کرا سکیں۔ یورپ کے اس تعلیمی طبقے کے جو پوری دنیا میں عمرانی علوم کے تصورات کے ضمن میں ابھی تک خود کو سب سے اوپر سمجھتا ہے۔

عمرانی علوم کے مطالعے کا تاریخی ارتقاء

کچھ لوگ یہ سوال پوچھ سکتے ہیں: اگر ایسا ہی ہے تو ہندوستانی، ایرانی یا چینی لوگ اس سلسلے میں خود کو یہ اجازت کیوں دیتے ہیں کہ وہ یورپیوں یا امریکیوں کے مرتب کردہ عمرانی علوم ہی سے خود کو خوراک بہم پہنچاتے رہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ہزارہا سال تک سماجی، سیاسی، سائنسی یا فوجی تنظیمات کی سوجھ بوجھ کے بغیر خود کو باقی رکھ سکیں؟ ہم اس نظریے کی مخالفت کرنے کے قابل کیوں نہیں ہیں کہ یورپی عمرانیات یا بشریات اور امریکی سیاسیات یا نفسیات ایک قسم کی حتمی چیزیں ہیں جن کے متعلق سوال نہیں اٹھایا جا سکتا؟ یا سادہ سی بات یہ ہے کہ ہم اس قدر ست ہیں کہ اس نوآبادیاتی ورثے کو چھوڑنا ہی نہیں چاہتے اور نہ ہی نئی سوچ پیدا کرنا چاہتے ہیں؟

یہاں اس بات کا مختصراً جائزہ لینا مفید ہوگا کہ یہ صورتحال کس طرح پیدا ہوئی۔

یورپ اور پھر امریکہ کے سیاسی تسلط کے زیر اثر آنے والے نوآبادیاتی معاشروں کا عقلی جائزہ دو اہم مرحلوں کو سامنے لے کر آتا ہے۔ پہلے نمبر پر ان کی عقلی اور روحانی روایات پر سوچا سمجھا حملہ کیا جاتا ہے جو اکثر اوقات اندرونی معاملہ بن جاتا ہے اور محکوم آبادی کا رہنما اور بااثر طبقہ بلا تنقید اسے قبول کر لیتا ہے۔ کسی بھی صورت میں ان کے پاس، کوئی اور راستہ بھی نہیں ہوتا۔

جبکہ دوسرے مرحلے میں مقامی نظام کو، جو کہ محکوم آبادی کے تجربات پر مشتمل ہوتا ہے، برملا طور پر مکمل تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو طاقت کے استعمال کا عمومی اظہار ہے۔

اس قسم کے ثقافتی حملوں کے لیے استعمال کیے جانے والے طریقہ کار کو سر جان ڈیوس (Sir John Davies)، جو آئرلینڈ کے لیے برطانوی وکیل تھا، نے ۱۶۱۲ء میں اپنی کتاب میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔ اس کتاب کا نام تھا:

A Discovery of the True Causes: Why Ireland was Never Entirely Subdued and Brought under Obedience of the Crown of England Until the Beginning of His Majesty's Happy Reign.

(ان حقیقی اسباب کی دریافت جن کی وجہ سے آئرلینڈ عزت مآب شاہ کے خوشحال دور حکومت تک مکمل طور پر انگلینڈ کے تابع نہ ہوسکا)

اگرچہ وہ آئرلینڈ کے حوالے سے اپنی کتاب لکھ رہا تھا لیکن اس کی باتیں ہر اس ملک پر صادق آتی ہیں جو نوآبادیاتی طاقتوں کے سیاسی تسلط کے زیر اثر آئے۔

''وہ خامیاں جن کی وجہ سے آئرلینڈ پر مکمل فتح نہ پائی جاسکی، دو قسم کی تھیں، اور ان امور پر مشتمل تھیں: پہلے نمبر پر، جنگ کی کمزوری اور دوسرے سول حکومت کا کمزور نظام۔ کیونکہ زمین کو اچھے بیج کے قابل بنانے کے لیے پہلے اسے توڑنا ضروری ہوتا ہے۔ جب اسے مکمل طور پر توڑ لیا جاتا ہے تو اس میں کھاد ڈال دی جاتی ہے۔ اس موقع پر کسان یا منتظم اس میں اچھا بیج نہ بوئے تو یہ پھر سے جنگل بن جائے گا اور گھاس پھونس کے علاوہ اس میں کچھ پیدا نہ ہوگا۔ چنانچہ ایک غیر تہذیب یافتہ ملک پر اچھی طرح سے حکومت کا انتظام چلانے اور اسے مکمل طور پر محکوم بنانے اور فتح کرنے سے قبل جنگ کے ذریعے اسے توڑ پھوڑ دینا چاہیے اور اسے مکمل فتح کرنے کے بعد اس پر اچھی طرح سے بیج نہ ڈالے جائیں اور حکومت کا انتظام صحیح طرز سے نہ چلایا جائے تو یہ جلد ہی پھر سے غیر تہذیب یافتہ بن جائے گا''۔[۴]

سچی بات تو یہ ہے کہ سامراج اور اس کے طور طریقوں کے اس اصولی طرزِ عمل میں کبھی بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

مثلاً، ہندوستان کی روایات پر حملے کا سرکاری طور پر اعلان ۱۸۱۲ء میں ولیم ولبر فورس (William Wilber Force) نے انگلستان کی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کیا جب اس نے کہا کہ ہندوستان کو 'تہذیب یافتہ' بنانے کا موثر ترین ذریعہ یہ ہے کہ انگریز اس امر کو یقینی بنائیں کہ پورے ملک کے مذہب کو عیسائیت سے بدل دیا جائے۔ ہندو آبادی کو عیسائی بنانے کی کوشش اس کے منہ پر طمانچہ ثابت ہوئی اور سامراجی حکومت کی قابل نفرت ناکامیوں میں سے ایک ثابت ہوئی۔

تاہم ۱۸۲۵ء میں گورنر جنرل لارڈ بابنگٹن میکالے (Lord Babington Macaulay) کی جانب سے پیش کردہ 'سرکاری یادداشت' کی شکل میں ایک بالکل نئی حکمت عملی وضع کی گئی جو جدید تعلیمی مہم کی بنیاد بن گئی اور نو آبادیاتی آقاؤں اور ان کے بعد آنے والوں کی توقعات سے کہیں بڑھ کر مفید ثابت ہوئی۔ اس انتہائی موثر یادداشت میں میکالے نے ہندوستان اور عربوں کے پورے عقلی اثاثے کو اپنے مشہور الفاظ میں یوں چت کر دیا:

"مجھے عربی یا سنسکرت کا کوئی علم نہیں ہے، لیکن میں نے وہ کیا ہے جو میں اپنی دانست میں ان کی اقدار کا صحیح فہم حاصل کرنے کے لیے کر سکتا تھا۔ میں نے مشہور ترین عربی اور سنسکرت کتب کے تراجم کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے یہاں بھی (ہندوستان میں) اور اپنے ملک (انگلستان) میں بھی مشرقی زبانوں کے ماہرین کے ساتھ تبادلہ خیال کیا ہے۔ میں اس بات کے لیے بالکل تیار ہوں کہ مشرقی تعلیم کو خود مشرقی لوگوں کے ذریعے پرکھوں۔ مجھے ان میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں ملا جو اس بات سے انکار کر سکے کہ کسی اچھی یورپی لائبریری کی محض ایک شیلف، ہندوستان اور عربی کے پورے مقامی ادب پر بھاری ہے۔ مغربی ادب کی فطری برتری کو بلاشبہ وہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں جو اس کمیٹی کے ممبر ہیں جو استشراقی تعلیم کے منصوبے کی حمایت کرتے ہیں۔

میرا خیال ہے اس بات سے بمشکل ہی اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ ادب کا میدان جہاں مشرقی ادیب سب سے آگے ہیں، شاعری ہے۔ اور میں بالیقین یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میں آج تک کسی ایسے مشرقی آدمی سے نہیں ملا جس نے یہ کہنے کی جرات کی ہو کہ عربی اور سنسکرت شاعری کا، عظیم یورپی قوموں کی شاعری سے موازنہ بھی کیا جا سکتا ہے لیکن جب ہم تخیلاتی ادب سے ان کتب کی طرف آتے ہیں جن میں حقائق بیان کیے گئے ہیں اور عام اصول و قوانین پر بحث کی گئی ہے، تو وہاں تو یورپیوں کی برتری کو کسی بھی پیمانے سے ناپا ہی نہیں جا سکتا۔ میرا یقین ہے کہ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ سنسکرت زبان میں لکھی گئی تمام کتب سے اخذ شدہ معلومات اس سے کہیں کم اہمیت رکھتی ہیں جو ہمیں انگلستان میں پڑھائی جانے والی ابتدائی جماعتوں کے حقیر ترین خلاصوں میں ملتی ہیں۔ طبعی اور اخلاقی فلسفے کے ہر شعبے میں دونوں قوموں کی قریب قریب یہی حالت ہے''۔[۵]

میکالے نے اصرار کیا کہ ایک نیا نظام تعلیم رائج کیا جائے جس کے بہت واضح اہداف تھے:

''میرا خیال ہے کہ اپنے محدود وسائل کے ساتھ، ہندوستان کی پوری آبادی کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کرنا تو ناممکن ہے۔ اس وقت ہمیں اپنی پوری کوشش اس امر میں صرف کرنی چاہیے کہ ایک ایسا طبقہ پیدا کریں جو ہمارے اور ان لاکھوں لوگوں کے درمیان جن پر ہم حکومت کر رہے ہیں، ترجمانی کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ ایسے لوگوں کا طبقہ، جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں لیکن اپنے ذوق، رائے، اخلاقیات اور عقلیت میں انگریز ہوں''۔[۶]

نوآبادتی تعلیم کے اس پروجیکٹ، اور اس کے ساتھ ساتھ تہذیبی جارحیت کے اظہار کو مختلف ممالک مثلاً ترکی، انڈونیشیا، فلپائن، اوٹیروا (نیوزی لینڈ) وغیرہ میں آزمایا گیا۔ یہ راتوں رات [نوآبادیات] کا 'شکار' معاشرے، یا 'شکست خوردہ' تہذیبیں بن گئیں۔ ان کے درخشاں ستاروں نے اس احساس کمتری کا فوراً ہی اپنی ذہنی مصنوعات میں اظہار کر دیا۔ افریقہ کے تناظر میں گوگی واتھیونگو

نے لکھا:

''سامراجیت کا سب سے بڑا ہتھیار جسے وہ اجتماعی سرکشی کے خلاف بروئے کار لائے اور در حقیقت ہر روز جسے آزماتے رہے، وہ تھا ''تہذیبی بم''......اس تہذیبی بم کا اثر یہ تھا کہ اس نے لوگوں کے اپنے ناموں، اپنی زبانوں، اپنے ماحول، اپنی جدوجہد کے ورثے، اپنے اتحاد، اپنی صلاحیتوں اور بالآخر خود اپنے بارے میں یقین کے عقیدے کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ اس بم نے ان کے ماضی کو ان کے سامنے ایسا ویرانہ بنا کر پیش کیا جہاں کسی قسم کی کوئی کامیابی نہیں تھی۔ نتیجتاً لوگوں نے اپنے ماضی سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ انہوں نے کوشش کی کہ وہ اس چیز سے اپنا تعلق ظاہر کریں جس سے درحقیقت ان کا دور دراز کا بھی واسطہ نہ ہو، مثلاً اپنی زبان کے بجائے، دوسرے لوگوں کی زبان۔ اس کی وجہ سے انہوں نے زوال پذیری اور رجعت پسندی اور ہر اس چیز سے اپنا تعلق محسوس کیا جو ان کی اپنی زندگی کے حسن کو گہنا دے''۔ ۷

یہ واقعتاً بہت ہی حیرت کی بات ہے کہ عملاً ہر نوآبادیاتی نظام کے شکار معاشرے کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ خود اپنی اور بالآخر اپنی تہذیب کی بے وقعتی کا اس طرح سے قائل ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی تہذیب کی ہر چیز پر ڈاکہ ڈالنے کی اجازت دے دے اور پھر انتہائی بے چارگی کے ساتھ خود کو ان کے طور اطوار کے مطابق ڈھال لے جو ان کی سرحدوں سے کہیں دور سے آئے ہوں۔

تہذیب کی اس ناکامی کا پیمانہ ناپنے لگیں تو اس کی ایک بڑی ہی نادر وجہ سامنے آتی ہے: وہ مشکل جسے سامراجی قوتوں کو بھی سہنا پڑا، جیسا کہ خود میکالے نے بھی اعتراف کیا تھا کہ وہ 'ساری' آبادی کو تعلیم نہیں دے سکتے۔ بالفاظ دیگر ہماری شناخت محض اس وجہ سے باقی رہ گئی کیونکہ ہم میں سے زیادہ تر لوگ انگریزی نہیں بول سکے، ہم نے اپنی مادری زبانوں کو باقی رکھا اور ہماری آبادی کے ایک بڑے حصے نے مغربی تعلیمی نظام میں خود کو سمونے میں بہت ہی کم دلچسپی ظاہر کی۔ وہ الگ تھلگ رہے، عدم دلچسپی کا اظہار کیا اور (مغربی تعلیم کو) اپنانے میں متحد نہ ہوئے۔

دومختلف معاشرے

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جغرافیائی طور پر ایک ہی جگہ رہتے ہوئے مکمل طور پر دومختلف معاشروں کی نسلیں سامنے آئیں جومختلف نظام تعلیم اور عقائد سے تعلق رکھتی تھیں۔ علم بشریات پر اپنی زبان میں لکھی گئی کتاب Mexico Profundo میں میکسیکو سے تعلق رکھنے والے ماہر علم بشریات گولر مو بونفل بٹالا نے ایک 'خیالی میکسیکو' کا تنقیدی حوالہ دیا ہے جسے مغربی ماہرین تعلیم اور اہل علم نے اس معاشرے پر مسلط کر دیا تھا۔ ۸ وہ اسے 'خیالی' اس وجہ سے نہیں کہتا کہ یہ حقیقتاً موجود نہیں تھا بلکہ اس وجہ سے اسے یہ نام دیتا ہے کہ یہ زیادہ تر میکسیکو کے باشندوں کی تہذیبی حقیقت کو جس کے تحت وہ زندہ تھے انکار کرتا تھا۔

بونفل کے مطابق 'غیر ہندوستانی بنائے جانے والے' (de-indianised) دیہاتی ہسپانوی باشندوں اور بہت بڑی تعداد میں ہجرت کر کے آنے والے لوگوں کی زندگیاں اس چیز پر مشتمل تھیں جسے وہ Mexico Profundo کہتا ہے۔ اس زندگی کی جڑیں نیم امریکی تہذیب (میسوامریکن) میں بوئی گئی تھیں جہاں ان کی خوراک کی ترسیل کا اپنا نظام تھا۔ اس معاشرے میں کام کرنے کا مطلب حتیٰ کہ آج بھی یہی ہے کہ انسان طبعی دنیا کے ساتھ ہم آہنگی کا تعلق قائم رکھے۔ صحت کا تعلق انسانی رویوں سے ہے اور خدمت عامہ کا تعلق بسا اوقات ہر فرد کی ذاتی ذمہ داری سے ہے۔ وقت ایک گردش کرنے والی چیز ہے اور انسان اپنا چکر، کائنات کے دوسرے چکروں کی طرح ہی پورا کرتے ہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ Mexico Profundo کے لیے یورپ بطور ایک تصوراتی نظام یا ایک مثالی نظام کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اگرچہ بونفل کے نظریات کچھ زیادہ ہی انقلابی محسوس ہوتے ہیں لیکن اس کی ایک ایسے معاشرے کی تصویر کشی — جو سمندر پار کے اہل علم اور انہی کے بھرتی شدہ مقامی رنگدار رنگروٹوں کے تصورات کے برعکس کام کرتا ہے — کو کسی بھی غیر مغربی معاشرے پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ ہم اپنے ملک میں اسے 'دوسرے ہندوستان' کا نام دیتے ہیں جو ہندوستان سے زیادہ بڑا ہے اور زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھیں تو اسے صرف اپنے آپ سے کام ہے اور یہ یورپ کے متعلق بالکل نہیں سوچتا۔

بالآخر لوگوں کے صرف دو طبقے اس نتیجے پر پہنچے کہ علم کی ترقی اور (انسانیت کی بھلائی) کے لیے مستقبل میں صرف یورپی سائنس ہی مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے پہلے نمبر پر یہ طبقہ (فطری طور پر) خود یورپی تھے اور اس کے بعد نوآبادیاتی عوام میں سے پڑھے لکھے اور خاص طور پر اعلیٰ تعلیم سے متعلقہ طبقہ تھا۔ اور ان دونوں کی وجوہات غلط تھیں۔

معروضیت کا فقدان

کسی بھی چیز کو پرکھنے اور جانچنے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اس میں معروضیت اور اعتبار کو برقرار رکھنے کے لیے اسے وہ لوگ جانچیں جو اس سے غیر متعلق ہوں۔ ایک انسان خود اپنے معاملے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمیں یہاں کیا نظر آتا ہے؟ مغربی سائنس، مغربی تاریخ سے منسوب نام نہاد حرکت دینے والی قوت اور کامیابیوں کی جانچ پرکھ مغرب سے تعلق رکھنے والے اہل علم، تاریخ دان اور لکھاری ہی کرتے ہیں۔ وہ انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ اپنی کامیابیوں کو نمایاں کرتے ہیں، وہ خود اپنے تاریخ دان بن جاتے ہیں، وہ خود اپنی عظمت کے گن گاتے ہیں۔ وہ اپنے طرز زندگی کی خود ہی تصدیق کرتے ہیں اور اس پر خوشیاں مناتے ہیں۔ اس زعم کا اظہار وہ دعویٰ ہے جو حال ہی میں کیا گیا ہے کہ امریکی معاشرہ 'تاریخ کے خاتمے (End of History)' کی علامت ہے، یعنی تاریخ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے اور یہ کہ انسانی ترقی کے ضمن میں اس سے آگے کا نہیں سوچا جا سکتا سوائے ٹیکنالوجی کی بہتری کے، جس کی کوئی حد ہی نہیں ہے۔

معروضیت کا فقدان اس قدر زیادہ اور کہیں تو اس احمقانہ حد تک جا پہنچا ہے کہ بسا اوقات بہت سے انسانی مشغلوں (اخلاقیات، سائنس اور ٹیکنالوجی، آرٹس وغیرہ کی تاریخ) کو مغربی لکھاریوں نے اس طرح ترتیب دیا ہے جو روئے زمین پر دوسرے انسانوں کی موجودگی ہی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ یورپ کی سرحدوں سے باہر بسنے والے انسانوں کے کردار اور ان کی ذہنی صلاحیتوں سے انکار، تنگ نظری اور مقامی تعلیم کی وجہ سے ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر دوسروں کی ذہنی صلاحیتوں کا اعتراف نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنے سے یورپ کا خود ساختہ دعویٰ، کہ وہ انسانی ترقی کی سیڑھی کی معراج پر ہے

اور باقی پوری انسانیت پر اس کی تہذیب کو فطری برتری حاصل ہے، ماند پڑ جائے گا۔

مغرب کے سماجی علوم کی علمی نوعیت دوسری عقلی روایات یا مشترکہ سائنس کے مقابلے میں نا قابل تبدل، خدائی، اغلاط سے مبرا اور عظیم آسمانی صحائف جیسی اہم نہیں ہے۔ اسے محض ایسا بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

مستشرقین کے کلام کی کامیابی کا خلاصہ یہ ہے: ہندوستان، عرب دنیا اور باقی ملکوں کے لوگ آج اس بات کے قائل ہو چکے ہیں کہ ان کی اپنی تاریخ، ان کے معاشروں اور ان کی روایات کے اصل ترجمان مغرب کے اسکالرز اور تبصرہ نگار ہیں نہ کہ ان کے اپنے لوگ۔

اس اجتماعی ذہنی شکست اور اہل علم کی ایک پوری نسل کے ہتھیار ڈالنے سے مایوس ہوکر حسین العطاس نے آج سے کئی عشرے قبل ان کے بقول 'اسیر ذہن (the captive mind)' کا تنقیدی جائزہ لیا جس میں انہوں نے تیسری دنیا کے ذہین اور باعلم افراد پر اس بنا پر تنقید کی کہ وہ مسلسل باہر سے درآمد شدہ اور دوسروں کی ملکیت علم کی روایات کے سامنے سر جھکائے ہوئے تھے۔ جن نظریات کا ان کے اپنے معاشروں، تجربات یا ان کی روایت سے برائے نام تعلق تھا۔[۹]

نگوگی واتھیونگو نے 'ذہن کو نوآبادیات سے پاک کرنا' (Decolonising the Mind) میں لکھا کہ ''غالب نظام کی حتمی فتح تب ہوتی ہے جب مفتوح قوم بھی غالب قوت کی خوبیوں کے گن گانا شروع کر دے۔''[۱۰]

بالآخر عقلی نوآبادیات کے خلاف نمایاں مزاحمت غلامانہ ذہنیت رکھنے والے یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ طبقے کی طرف سے شروع نہیں ہوئی بلکہ معاشرے کے سب سے کم اہمیت رکھنے والے گروہوں، جن میں امریکی، ہندوستانی، اوٹیورا (نیوزی لینڈ) میں ماوری قبیلے سے تعلق رکھنے والے افراد، آسٹریلیا اور کینیڈا میں آدی باسیوں (آسٹریلیا کے قدیم باشندے) اور افریقی ممالک سے تعلق رکھنے والے اہل علم کی بڑی تعداد نے مزاحمت شروع کی۔

یہ مزاحمت اسلام کی جانب سے بھی آئی اگرچہ کچھ ملے جلے انداز سے، کیونکہ زیادہ تر اسلامی

معاشرے اپنی مذہبی روایات اور مغرب کی (لادین، مادہ پرستانہ) تعلیم میں موافقت پیدا نہیں کر سکتے تھے۔

ہندوستان میں، مغربی سائنس کو، جس میں مغربی سوشل سائنس بھی شامل ہے، صاحبِ اختیار ہندوستانی ماہرین تعلیم نے من وعن تسلیم کر لیا ہے۔ جو اس کے نام نہاد عقلی یا تعلیمی طبقے کی ذہنی شکست کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ملک کے (نام نہاد) اعلیٰ ترین دماغ جو انڈین انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (IITS) میں داخلہ لینے کے اہل قرار پاتے ہیں، مٹھی بھر درآمد شدہ اداروں سے اپنا صلہ پاتے ہیں۔ وہ ادارے جو بیرونی ممالک کی معیشتوں اور پیداواری نظام کے لیے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ کارکن بھرتی کرنے کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

جب سے امریکہ دنیا کی معیشت پر حاوی ہوا ہے، تعلیمی نصاب کے غلبے کا جھکاؤ امریکی جامعات کی جانب ہو گیا ہے اور ان کے تعلیمی فارمولے باقی پوری دنیا بشمول برطانیہ کے لیے ایک معیار کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ جیسا کہ اعلیٰ تعلیم تک پہنچانے والے اداروں کا کنٹرول سنبھالنا امریکہ اپنا فطری حق سمجھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جامعات کے سوچنے کا انداز اس ملک کے طرزِ فکر سے اپنی خوراک لے گا جو سفید فام مردانہ آبادی اور خود اپنے نقطہ نظر کے علاوہ کم ہی کسی چیز کو ہضم کرتا ہے۔ جس نے وہاں اپنا غلبہ محض تشدد کے بل پر قائم کیا ہے اور جو صرف ان طبقات کے پھلنے پھولنے کو برداشت کرے گا جو اس کے نظریات سے گہری ہمدردی رکھتے ہوں گے۔

یکساں تعلیمی خوراک

۱۹ویں صدی میں سفید فام امریکیوں کے نظام تعلیم میں یہ نقص پایا جاتا تھا کہ ملک کے اندر مختلف اسکولوں اور کالجوں میں دی جانے والی تعلیم یکساں نہیں تھی۔ اس قضیے کو بالآخر دس لوگوں کی کمیٹی (Committee of Ten) کی ایک رپورٹ کے ذریعے، جو ۱۸۹۲ء میں چارلس ڈبلیو ایلیٹ (Charles W Eliot) کی سربراہی میں قائم کی گئی تھی- حل کر لیا گیا۔ امریکہ کے اندر پلنے بڑھنے والے لوگوں کے لیے یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے لازمی مضامین کا فیصلہ اس کمیٹی نے کیا تا کہ یہ لوگ ان

مضامین کو پڑھنے کے بعد باقی ساری دنیا کی تعلیمی دنیا پر حکومت کریں اور معمولی تبدیلیوں کے بعد آج بھی ایسا ہی ہے۔ یہ مضامین اور ان کو پڑھانے کا دورانیہ بھی کمیٹی نے ہی طے کیا ہے۔ (نو مضامین یہ تھے: ۱۔ لاطینی، ۲۔ یونانی، ۳۔انگریزی، ۴۔ دوسری جدید (یورپی) زبانیں، ۵۔ ریاضی، ۶۔ طبیعیات، علم فلکیات، علم کیمیا، ۷۔ نیچرل ہسٹری (طبعی تاریخ)، ۸۔ تاریخ، نظام حکومت اور سیاسی معیشت، ۹۔ طبعی جغرافیہ، علم ارضیات، علم موسمیات۔)[۱۱]

جس اہم بات کو نوٹ کرنا مقصود ہے وہ یہ کہ تعلیم حاصل کرنے والے تمام طالب علموں کے لیے خواہ وہ کسی بھی ملک سے تعلق رکھتے ہوں، جن کے مختلف قسم کے ماحول ہیں، عقلی تاریخ اور تہذیبی روایات مختلف ہیں، ایک ہی جیسی خوراک پیدا کرنا اور اسے استعمال کروانا...... اس پورے عمل پر کبھی کوئی سوال نہیں اٹھایا گیا۔ نئے نصاب کو ہر جگہ قبول کر لیا گیا کیونکہ جدید جامعہ کی روایات نے محض نقالی اور بلا سوچے سمجھے قبولیت کو پہلے کی طرح برقرار رکھا تھا۔ مثلاً نگوگی واتھیونگو نے افریقہ کی تعلیمی برادری کو 'نقالی اور بے سوچے سمجھے ہر چیز دہرانے' پر لعن طعن کی تھی۔ (رابندر ناتھ ٹیگور نے، جو ہندوستان کا بڑا ہی قابل شخص تھا، آج سے تقریباً سو سے بھی زیادہ سال پہلے ایک کہانی لکھی تھی جس میں اس نے تعلیمی نظام کی ہو بہو نقل کی تھی)۔

نئی تعلیمی تہذیب میں چھپی چھپائی نصابی کتابیں ہی تعلیم کے لیے اہم ترین ذریعے کے طور پر حکمران تھیں کیونکہ یہ تعلیمی طبقہ حقیقی دنیا کی نسبت کتابوں میں زیادہ آسانی محسوس کرتا اور کتاب بآسانی اسے حقیقی دنیا سے الگ کر سکتی تھی۔ اس چیز نے 'آفاقیت' کے دعووں کو مزید جلا بخشی کیونکہ کسی نظریے کے لیے مقامی تجربے کو اہم نہیں سمجھا جاتا تھا اور ہر صورت میں نظریہ تو مغربی تعلیمی طبقے کی طرف ہی سے آتا تھا۔

کسی بھی مرحلے پر ہمارے اپنے معاشروں میں کبھی سنجیدگی سے یہ سوال نہیں اٹھایا گیا کہ ہمارا حصول علم کس جانب بڑھ رہا ہے۔ صرف معدودے چند پیش بینوں نے اس کے خطرناک نتائج کا ادراک کیا۔ عمومی مزاج کے لحاظ سے ایک پرامن فرد، مہاتما گاندھی، اپنے لوگوں کو دوسرے درجے کا

مغربی شہری بنائے جانے کے خیال پر اس قدر برہم تھا کہ اس نے اپنی کتاب ''ہند سوراج'' میں اعلان کیا کہ ''یورپی تہذیب کی حوصلہ افزائی کی سزا کے طور پر عمر بھر کے لیے جزیرہ انڈمان (سزا یافتگان کی بستی یعنی جیل) بھیج دیا جانا بھی ناکافی سزا ہے۔''[۱۲] جیسا کہ وینے لال کا کہنا ہے کہ یہ قطعاً حیرت کی بات نہیں ہے کہ مغربی سماجی علوم کے پھیلاؤ کے تناسب سے ہی باقی ساری دنیا میں انسانوں کے دکھوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ان میں علمِ بشریات سے لے کر جغرافیہ اور معاشیات تک کے علوم شامل ہیں۔[۱۳]

چنانچہ دنیا کے تعلیمی نظام میں سامراجیت ایک فطری خصوصیت کے طور پر موجود رہی ہے۔ جیسا کہ وارڈ چرچل اپنی کتاب White Studies میں لکھتا ہے کہ ''یورپ کی بالاتری اور غلبے کا تسلسل اور اس کا پھیلاؤ حتیٰ کہ اس کی بقا کا انحصار بھی اس کے اپنے عقلی مثالی نمونے، اس کے طے شدہ طرز فکر، طرز نظر، طرز فہم اور باقی تمام دوسروں کو نکال باہر کرنے کے عمل کو جاری رکھنے پر ہے۔''[۱۴]

درحقیقت آج بھی اس غلبے کو برقرار رکھنے کی طاقت کے لیے یہ ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں۔ نصابی کتابوں کی تجارت پر کنٹرول، سماجی علوم کے ادب کا استناد، چند مخصوص سکالرز کی پذیرائی، دوسری عقلی روایات سے آنے والے خیالات ونظریات کو دبانا اور ان کی ناقدری کرنا، جہاں تک ممکن ہو سکے ان نظریات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا، اور خیالات کی گردش کو امیرانہ گروہی نظام کے ذریعے قابو میں رکھنا، اشاعتی اداروں اور جرائد دونوں کے ذریعے۔

یہی وجہ ہے کہ مہاتما گاندھی، ٹالسٹائی، آروبندو، ماؤزے تنگ اور دوسری اہم شخصیات نے نظامِ تعلیم کو ازسرنو ترتیب دینے کے لیے کام کیا اور اسے انہوں نے اپنے سیاسی کام کا ایک ضروری جزو سمجھا۔ گاندھی نے 'نئی تعلیم' کا نظام متعارف کروایا جس میں طلبہ اپنے ہاتھ سے کام کرتے اور ایسا کرنے کے ساتھ وہ علم بھی حاصل کرتے، نیز اپنی روزی کماتے۔

[کلاڈ الویرز کثیر ادارہ جاتی جامعہ پروجیکٹ (Multiversity Project) کے کوآرڈی نیٹر ہیں۔ وہ 'تاریخ کو استعماریت سے پاک کرنا' (Decolonizing History) کے مصنف ہیں۔ اس کتاب میں ہندوستان اور چین

جیسے معاشروں کے بارے میں مغربی تعبیر کی کمزوریاں عیاں کی گئی ہیں۔ زیرِ نظر مضمون ایک بین الاقوامی کانفرنس میں پیش کیے گئے ان کے مقالے سے ماخوذ ہے۔]

(ترجمہ: منزہ صدیقی)

Source: Third World Resurgence No. 266/267, October/November 2012, pp 20-24.

......حواشی......

۱۔ دیکھیے: http://www.iescp.org/index.php/events.

۲۔ یونیسکو ورلڈ سوشل سائنس رپورٹ اِس ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہے: www.unesco.org/shs/wssr

3. Farid Alatas, *Alternative Discourses in Asian Social Science*, 2006, p.13.

4. Sir John Davies, *A Discovery of the True Causes Why Ireland Was Never Entirely Subdued Nor Brought Under Obedience of the Crown of England Until the Beginning of His Majesty's Happy Reign* (1612), in Henry Morley, ed., *Ireland Under Elizabeth and James the First* (London: George Routledge and Sons, Limited, 1890), p. 291.

5. See: http://www.vvv03.com/Minutes.pdf

6. See: http://www.vvv03.com/Minutes.pdf

7. Ngugi wa Thiong'o, *Decolonising the Mind,* 1981, p.3.

8. Guillermo Bonfil Batalla, *Mexico Profundo: Reclaiming a Civilization,* 1996.

9. Syed Hussein Alatas, *The Captive Mind,* 1969; *The Captive Mind Revisited,* Multiversity, 2006.

10. Ngugi wa Thiong'o, work cited, 1981, p.20.

11. See: www.mathcurriculumcenter.org/PDFS/.../comm_of_10_summary.pdf

12. MK Gandhi, *Hind Swaraj,* 2008 edition, p.89.

13. Vinay Lal, 'The Disciplines in Ruins: History, the Social Sciences, and Their Categories in the "New Millennium"', *Emergences,* Vol.12, No.1, 2002, p.143.

14. Ward Churchill, *White Studies: The Intellectual Imperialism of Higher Education,* Citizens International, 2002, p.25.